دوسرا باب

تشکیلِ پاکستان

MAKING OF PAKISTAN

1۔ برصغیر میں تحریکِ احیائے اسلام:

برصغیر پر مسلمانوں نے ایک ہزار سال سے زیادہ حکمرانی کی لیکن جب اُنھوں نے اسلام کے سنہری اصولوں سے انحراف کرنا شروع کیا تو آہستہ آہستہ اُن کا زوال شروع ہوگیا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے حالات خراب تر ہوتے چلے گئے۔ بے شمار دینی علماء اور شخصیات نے برصغیر میں اسلامی تعلیمات اور اقدار کے احیاء کے لیے اصلاحی تحریکوں کا آغاز کیا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں اسلامی روح بیدار کرنے کے لیے اُن کی جدوجہد کو تحریکِ احیائے اسلام کہتے ہیں۔ اِن میں مندرجہ ذیل تحریکیں بہت نمایاں ہیں۔ ان کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہوئی۔

(i) شاہ ولی اللہ کی تحریک:

شاہ ولی اللہ کا اصل نام قطب الدین تھا مگر اپنی روحانی صفات کی وجہ سے 'ولی اللہ' کہلاتے تھے۔ وہ 21 فروری 1703ء کو دہلی کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام شاہ عبدالرحیم تھا جو ایک معروف عالم اور دینی رہنما تھے۔ 15 سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ نے دینی تعلیمات کے تمام بڑے شعبوں میں اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ 17 سال کی عمر میں اپنے والد کی وفات کے بعد وہ اپنے والد کے جانشین ہوئے اور مدرسے کے شیخ نامزد ہوگئے۔

مارچ 1707ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد برصغیر طوائف الملوکی اور افراتفری کا شکار ہوگیا۔ اُس کی نمایاں وجہ مسلمانوں کی اخلاقی و مذہبی پستی اور گراوٹ تھی۔ شاہ ولی اللہ نے بہت باریک بینی سے اُن عوامل کا تجزیہ کیا جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنے تھے اور اِس نتیجے پر پہنچے کے غیر مسلموں کے اثرات کی بدولت اسلامی روح و جذبہ اور اقدار تباہ ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کی فوجی قوت تباہ ہو چکی تھی۔ دہلی سے آگرہ تک کے علاقے میں مسلمان جٹوں اور مرہٹوں کی قبائلی طاقت کے رحم و کرم پر تھے۔ شاہ ولی اللہ نے اندازہ لگا لیا کہ اگر مسلمان اِسلامی طرزِ زندگی کی پیروی نہیں کریں گے تو آہستہ آہستہ اپنے مقام سے گرتے چلے جائیں گے۔ اِن حالات میں اُنھوں نے برصغیر میں اسلامی تعلیمات اور اقدار کے احیاء کی منصوبہ بندی کی۔

شاہ ولی اللہ نے اُس وقت کے مغل شہنشاہ، حیدرآباد دکن کے نظام، روہیلہ سردار حفیظ الملک اور نجیب الدولہ کو خطوط لکھے اور اُنھیں برصغیر میں مسلم معاشرے کی زبوں حالی کے بارے میں آگاہ کیا۔ اُنھوں نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو بھی خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ مرہٹوں کے ظلم و ستم سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نجات دلائیں۔ اس کے جواب میں احمد شاہ ابدالی نے 1761ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو عبرتناک شکست دی۔ اس شکست کے بعد مرہٹے پھر کبھی نہیں سنبھل سکے۔

شاہ ولی اللہ کی انتہائی اہم خدمت یہ ہے کہ آپ نے قرآنِ مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس سے لوگوں کو قرآن مجید کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ اُس کے بعد اُن کے صاحبزادوں اور دیگر افراد نے اُس کے اُردو ترجمے بھی کیے۔ اُنھوں نے حدیث، فقہ اور تفسیر پر کتابیں بھی لکھیں۔ اُن کی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور و معروف کتاب "**حجة اللّٰه البالغه**" ہے۔ اُن کی تصانیف کا پیغام یہ ہے کہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے جو تمام اِنسانیت کے لیے ترقی اور خوشحالی کا ضامن ہے۔ 10 اگست 1762ء کو شاہ ولی اللہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عبدالعزیز نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ سے شاہ ولی اللہ کے مشن کو جاری رکھا۔

(ii) سید احمد شہید بریلوی کی تحریک:

برصغیر کی تاریخ میں سید احمد شہید تبلیغ اسلام اور برصغیر کی بدی کی قوتوں کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے بہت مشہور و معروف ہیں۔ سید احمد شہید 1786ء میں رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتداء میں انھوں نے صرف معمولی تعلیم حاصل کی کیوں کہ آپ کا زیادہ رجحان فوجی تربیت کی جانب تھا۔ بعد میں آپ نے خود کو سماجی و معاشرتی خدمات کے لیے وقف کر دیا۔ آپ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے بہت متاثر تھے اور اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کے پختہ پیروکار تھے، انھوں نے دینی تعلیم شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی۔

سید احمد شہید کو برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کے بارے میں شدید تشویش تھی۔ وہ برصغیر میں اسلام کی برتری اور اقتدارِ اعلیٰ کا احیاء چاہتے تھے۔ سید احمد اور اُن کے رفقاء برصغیر میں اسلامی ریاست کے قیام کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اُنھوں نے بت پرستی اور شرک کے خلاف ایک زبردست مہم کا آغاز کیا اور مسلمانوں کو اللہ کی توحید کا درس دیا۔ یہ مہم "تحریک مجاہدین" کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ سید احمد شہید کی تحریک کے مقاصد حسب ذیل تھے۔

(الف) اللہ کی توحید کی تبلیغ کرنا۔

(ب) اسلامی تعلیمات کی احیاء۔

(ج) اسلامی اصولوں کے مطابق برصغیر میں ایک ریاست قائم کرنا۔

(د) مسلمانوں کو ایسے اعمال و افعال اور خیالات سے بچانا جو اسلامی اقدار کے منافی ہوں۔

(ہ) جہاد کی تبلیغ کرنا کیونکہ بدی کی قوتوں سے چھٹکارہ پانے اور آزادی کا حصول مسلح جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اسلامی اقدار اور روایات کے احیاء کے لیے سید احمد شہید پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے سے سکھوں کا اقتدار ختم کرنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے پنجاب اور سرحد میں جہاد کا آغاز کردیا۔ بدی کی قوتوں کے خلاف جہاد میں شاہ اسماعیل شہید اپنے چھ ہزار پیروکار کے ساتھ سید احمد کے ساتھ شریک ہوگئے۔ سید احمد نے دہلی اور پنجاب کے کئی علاقوں کا دورہ کیا جہاں ایک کثیر تعداد میں اُن کے پیروکار اُن کے ساتھ شامل ہوتے گئے۔

وہ 1826ء میں سندھ آئے اور پیر پگارو کو مدد کے لیے درخواست کی۔ جس نے اپنے جانثار مریدوں کو ان کے لشکر میں شامل ہونے کا حکم دیا جنھیں ''حر'' کہتے ہیں۔ سید احمد اپنے اہل وعیال کو پیر پگارو کی حفاظت اور سپردگی میں دے کر خود جہاد پر روانہ ہوگئے۔

سید احمد شہید دسمبر 1826ء میں نوشہرہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ) پہنچے اور اسے اپنا مرکز اور صدر مقام بنالیا۔ سکھوں کے خلاف پہلی جنگ 21 دسمبر 1826ء کو اکوڑہ کے قریب لڑی گئی، جس میں سکھوں کو شکست ہوگئی۔ سکھوں کے خلاف دوسری جنگ حضرو کے مقام پر لڑی گئی۔ اِس میں بھی مسلمان فتحیاب رہے۔ اِن فتوحات سے پٹھانوں کی ایک بڑی تعداد متاثر ہوئی اور وہ بھی تحریک جہاد میں شامل ہوگئے۔ مجاہدین کی تعداد اسی ہزار تک پہنچ گئی۔ سید احمد کو ''امیر المومنین'' کا منصب دے دیا گیا۔ اور سید احمد شہید کے فتح کیے ہوئے علاقوں میں اسلامی قوانین نافذ کردیے گئے۔

ابتداء میں تحریکِ جہاد بہت کامیابی سے جاری تھی لیکن فوراً ہی سید احمد کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ کچھ قبائلی سرداروں نے آپ کو زہر دے کر قتل کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح مہاراجہ رنجیت سنگھ (1780ء تا 1839ء) نے سردار یار محمد اور اُس کے بھائی سلطان خان کو رشوت دی کہ وہ سید احمد کے خلافت کے خلاف سازش کریں۔ سرداروں کی نا فرمانیوں کی وجہ سے سید احمد بہت ناامید اور مایوس ہوگئے۔ سید احمد نے بالاکوٹ کو اپنا نیا صدر مقام بنالیا، اُنھوں نے مظفر آباد سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ وہاں مجاہدین اور سکھوں کے درمیان سخت معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ مسلمان بڑی بہادری اور جرأت سے لڑے لیکن 6 مئی 1831ء کو سید احمد اور اُن کے جانثاروں کو شہید کردیا گیا۔ ہزاروں مجاہدین میں ۹ سے صرف تین سو زندہ بچے اور اس طرح سید احمد شہید کی خلافت ختم ہوگئی اور اسلامی ریاست قائم کرنے کا اُن کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ لیکن اسلامی معاشرے اور ریاست کے احیاء کے لیے عظیم جدوجہد اور کوششوں کے حوالے سے سید احمد شہید

اور شاہ اسماعیل شہید کے نام ہمیشہ یادرکھے جائیں گے۔ دونوں رہنماؤں کو بالاکوٹ کے نزدیک دفن کیا گیا۔

(iii) فرائضی تحریک:

برصغیر میں اسلامی فکر کی شمع کو دوبارہ روشن کرنے کے لیے احیائی تحریکوں کے آغاز کرنے والے سب سے نمایاں مصلحین میں حاجی شریعت اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ وہ 1761ء میں فرید پور (بنگال) میں پیدا ہوئے۔ بہت کم عمری میں ہی آپ مقدس شہر مکہ روانہ ہوگئے جہاں آپ نے بیس سال قیام کیا اور دینی تعلیم حاصل کی۔ وہ 1802ء میں اپنے آبائی وطن واپس آئے۔ دینی معاملات میں اپنے اہلِ وطن کی انتہائی خستہ اور ناگفتہ حالت دیکھ کر آپ کو شدید صدمہ پہنچا۔ اُنھوں نے بنگال کے مسلمانوں کو غیر مسلم رسوم و رواج سے چھٹکارہ پانے کا مشورہ دیا۔ اُنھوں نے اسلامی احکامات پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت پر زور دیا اور اِن اسلامی احکامات کو اُنھوں نے فرائض کا نام دیا۔ اسی لیے اسلامی اصولوں کے لیے اُن کی تبلیغ و تلقین اور مسلمانوں کے لیے اصلاحی تحریک ''فرائضی تحریک'' کہلاتی ہے۔

فرائضی تحریک کا بنیادی مقصد اُن اسلامی رسوم و رواج و روایات کو مٹانا اور ختم کرنا تھا جو بنگالی مسلمانوں میں سرائیت کر گئی تھیں۔ اور اس نے مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق صراطِ مستقیم پر لانے میں بڑی مدد کی۔ ابتداء میں اُنھیں بہت مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آہستہ آہستہ اُن کی تحریک نے بنگالی مسلمانوں میں خوداعتمادی کا جذبہ بیدار کر دیا۔

حاجی شریعت اللہ کے انتقال (1840ء) کے بعد اُن کے فرزند محمد محسن عرف دودو میاں فرائضی تحریک کے رہنما بن گئے اور انھوں نے اس کو مزید موثر بنا دیا۔ اُنھوں نے مسلمان کسانوں اور مزارعین کے ہندو زمینداروں کے ظلم وستم اور چیرہ دستیوں کے خلاف جمع کیا۔ محمد محسن کی کوششوں کے نتیجے میں بنگال کے مسلم مزارعین ہندو زمینداروں اور جاگیرداروں کے بہیمانہ تسلط سے آزاد ہوگئے۔ وہ بنگال کے مسلمان مزارعین کے حقوق کے عظیم علمبردار بن گئے۔ برطانوی اور ہندو تاجر اور زمیندار اُن کے خلاف ہوگئے۔ لیکن اُنھوں نے اُن کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اپنا مشن جاری رکھا۔ فرائضی تحریک کے نتیجے میں بنگالی مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت بہت بہتر ہوگئی اور بڑی حد تک مزارعین کے حقوق کا تحفظ ہوگیا۔

(iv) علی گڑھ تحریک:

انگریزوں نے مسلمانوں سے برصغیر کی قیادت چھین لی تھی اسی لیے وہ مسلمانوں کو اپنا سخت مخالف اور دشمن سمجھتے

تھے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمان انگریزوں کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں کا نشانہ بن گئے۔ مسلمانوں کو دینی و مذہبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی حقوق سے محروم کردیا گیا۔ اِس سے مسلمانوں میں خوف و ہراس اور بددلی پھیل گئی۔ دوسری جانب ہندوؤں نے انگریزوں کے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیا اور زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کرنے لگے۔ اِن حالات میں سرسید احمد خان (1817ء تا 1898ء) نے برصغیر کے مسلمانوں کے رہنما اور قائد کے فرائض سنبھال لیے۔ اُنھوں نے مسلمانوں میں بیداری کی تحریک کا آغاز کیا۔ اُن کی تحریک ''علی گڑھ تحریک'' کہلاتی ہے۔ اس تحریک کے اصل مقاصد حسبِ ذیل تھے۔

(الف) عمومی بیداری اور شعور:

سرسید احمد خان نے برصغیر کے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ جان لیں کہ اُن کا سنہرا دور گزر چکا ہے اور اب اُن پر انگریز حکومت کر رہے ہیں اور اُنھیں اِس ارضی اور معروضی حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے اور ماضی میں رہنے کی بجائے وہ اپنے حال پر نظر رکھیں اور مستقبل کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کریں۔ اِس طریقے سے سرسید نے مسلمانوں کی اکثریت کی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

(ب) انگریزوں کے ساتھ خیرسگالی تعلقات کا قیام:

سرسید احمد نے انگریزوں کے ساتھ خیرسگالی اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اُنھوں نے انگریزوں کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ 1857ء کی جنگ کے صرف مسلمان ہی ذمہ دار نہیں تھے۔ ہندو اور ہندوستان کی دوسری اقوام نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ انگریزوں کے ذہن سے مسلمانوں کے بارے میں شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے سرسید احمد نے ایک کتابچہ ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کے نام سے تحریر کیا تھا۔ اس میں اُنھوں نے 1857ء کی جنگ کی مندرجہ ذیل حقیقی وجوہات کی نشاندہی کی۔

(الف) برطانوی حکومت کی کارکردگی عوام کی توقعات سے بہت پست تھی اور اس وجہ سے عوام سخت برہم تھے۔

(ب) حکومت عوام کے مسائل کو سمجھنے میں ناکام ہوگئی کیونکہ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔

(ج) حکومت کے پاس عوام کی فلاح و بہبود کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ عوام عام طور پر اور مسلمان خاص طور پر بہت زیادہ غریب ہوگئے تھے۔

(د) حکومت نے ایسے قوانین اور ضوابط نافذ کردیئے تھے جو برصغیر کے عوام کے رسوم و رواج اور روایات کے منافی تھے۔

(ہ) حکومت کے انتظامی نظام میں سماج دشمن اور ناپسندیدہ عناصر موجود تھے اور ان عناصر نے عوام میں بے چینی پیدا کردی تھی۔ اپنے ذاتی مفاد کے لیے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے عوام اور انگریزوں کے درمیان تصادم کی کیفیت پیدا کی جائے۔

(ج) **جدید تعلیم کے لیے ترغیب و تحریک:**

سر سید احمد کو پورا یقین تھا کہ جب تک برصغیر کے مسلمان تعلیم نہیں حاصل کریں گے اور سائنسی علوم نہیں سیکھیں گے، اُس وقت تک وہ پسماندہ رہیں گے۔ اور برصغیر کی دیگر غیر مسلم اقوام سے مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ اُنھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ انگریزی زبان سیکھنے میں دلچسپی ظاہر کریں تاکہ سائنسی علم سے فیضیاب ہوسکیں اور اِس کا ماخذ علوم کی مغربی شاخیں تھا۔

(د) **غیر متنازع اور عدم تشدد کی سیاست:**

سر سید احمد نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ خود کو اُس وقت تک سیاست سے علیٰحدہ رکھیں جب تک مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہوجاتے ہیں۔ سر سید احمد چاہتے تھے کہ مسلمان صرف تعلیم حاصل کرنے پر اپنی توجہ مبذول رکھیں اور سیاسی رسہ کشی سے دور رہیں۔

علی گڑھ تحریک کی امتیازی خصوصیت:

علی گڑھ تحریک جلد ہی ایک جامع اور مربوط تحریک بن گئی۔ جہاں سے برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کا آغاز ہوا۔ بیشمار اہم شخصیات مثلاً نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا چراغ حسن نے علی گڑھ تحریک کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ تحریک کی اہم اور امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(i) **تعلیمی سرگرمیاں:**

سر سید احمد اِس نظریے کے حامی تھے کہ جدید تعلیم کا حصول ہندوستان میں مسلم معاشرے کی ترقی اور فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ اُنھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ جدید علم سیکھیں۔ اِسی لیے اولاً اُنھوں نے 1862ء میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ بعد میں اس کو علی گڑھ منتقل کردیا گیا۔ اِس ادارے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مغربی کتب کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اس کے بعد سر سید کیمبرج یونیورسٹی (انگلستان) کی طرز پر علی گڑھ میں ایک اسکول قائم کیا جس کو بعد میں کالج کی سطح تک بڑھادیا۔ اس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم اے او کالج) رکھا گیا۔ سر سید احمد نے مسلمان نوجوان نسل کو اِس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگریزی زبان سیکھیں تاکہ جدید سائنسی علوم کا حصول آسان ہو جائے۔ اس کی وجہ سے اردو زبان کے فروغ میں بھی مدد ملی۔

(ii)

1857ء کی جنگِ آزادی مسلمانوں کے لیے ناقابل بیان نفرتوں، انتقامی کاروائیوں اور اذیتوں کا سبب بنی۔ اُن کو معاشی اور اقتصادی طور پر سخت نقصان پہنچا۔ اُن کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کے منصب اور اعلیٰ مقام کو حاصل کرنے کے لیے سرسید نے مندرجہ ذیل اقدام کیے۔

(i) ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' اور ''ہندوستان کے وفادار مسلمان'' نامی کتابچے تحریر کر کے مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اِسی طرح مسلمانوں کے خلاف معاندانہ اور سفاکانہ اقدامات کم ہو گئے۔

(ii) مسلمانوں پر ملازمتوں کی پابندیاں نرم کر دی گئیں۔

(iii) جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی جو جائیدادیں اور ملکیتیں چھین لی گئی تھیں وہ لوٹا دی گئیں۔

(iv) ترقی و فروغ کے مختلف پروگراموں میں مسلمانوں کو شامل کیا گیا۔

مختصر یہ کہ سرسید کی علی گڑھ تحریک برصغیر میں مسلمانوں کے لیے طاقت اور قوت کا ذریعہ بن گئی اور اِسی نے دوقومی نظریے کی بنیاد فراہم کی۔

2۔ دوقومی نظریے کا ارتقاء:

دوقومی نظریے سے مراد یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان (جنوبی ایشیا) میں دو بڑی قومیں رہتی ہیں۔ یہ قومیں ہندو اور مسلم ہیں۔ یہ دونوں قومیں سینکڑوں سال تک ایک دوسرے کے ساتھ رہی ہیں۔ لیکن اپنے مخصوص اور منفرد مذہبی اور معاشرتی نظاموں کی وجہ سے باہم ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکیں۔

ابتدا میں سرسید نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹانے اور اُن میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلم (تعلیمی) اداروں میں ہندو طلبہ کو داخلے دیے گئے اور ہندو اساتذہ کا تقرر کیا گیا۔ لیکن سرسید کو اُس وقت سخت مایوسی ہوئی جب ہندوؤں نے اُردو کے مقابلے میں ہندی زبان کے فروغ کے لیے مہم چلائی۔ ہندو یہ چاہتے تھے کہ ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ ہندی اور اُردو کے اِس تنازع نے سرسید کے ذہن کو بدل کے رکھ دیا اور پھر اُنھوں نے دوقومی نظریے کی بنیاد پر اپنی سیاسی حکمت عملی استوار کی۔ یہ دوقومی نظریے کی ابتدا تھی۔ سرسید پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ''قوم'' کی اصطلاح استعمال کی۔ کیوں کہ اُن کا مذہب جدا تھا۔ اُن کی اپنی

مخصوص اور منفرد تہذیب وثقافت تھی۔ اُن کا فلسفہ، ثقافت، اخلاقی اقدار اور معیشت بالکل جداگانہ تھی۔

سرسید احمد کے بعد برصغیر کے کئی رہنماؤں مثلاً: مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا محمد علی جوہر، چوہدری رحمت علی، علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ نے درست طور پر یہ اعلان کیا کہ مسلمان ایک علیٰحدہ قوم ہیں۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:

"نہ ہندوستان ایک ملک ہے اور نہ ہی اِس کے باشندے ایک قوم، یہ ایک برصغیر ہے جس میں کئی اقوام رہتی ہیں۔ اِن میں ہندو اور مسلم دو اہم اقوام ہیں۔"

قائدِ اعظمؒ کی بے شمار تقاریر اور بیانات میں اِس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو ایک اقلیت نہ سمجھا جائے بلکہ یہ ایک قوم ہیں۔ اُن کا اصرار تھا کہ برصغیر کے سیاسی تعطل (ڈیڈلاک) کا منصفانہ حل صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو بحیثیت ایک علیٰحدہ قوم تسلیم کیا جائے۔

ہندوؤں کے یہ عزائم بہت واضح تھے کہ وہ اپنی اکثریت کی بنیاد پر مسلمانوں پر برتری اور فوقیت حاصل کرلیں۔ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں مسلمانوں کو پسماندہ رکھنا چاہتے تھے۔ دوسری جانب مسلمان بحیثیتِ قوم اپنے علیٰحدہ وجود اور شناخت کے بارے میں قدر پختہ اور بے لچک ہو چکے تھے اور اپنے لیے ایک علیٰحدہ مادرِ وطن چاہتے تھے۔ ہندو مسلم تنازع سے انگریز سخت الجھن میں تھے اور اِس مسئلے کا سیاسی حل چاہتے تھے۔

دسمبر 1885ء میں ایک انگریز اے۔ او۔ ہیوم نے انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی تاکہ لوگوں کو اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے ایک پلیٹ فارم مل جائے اور وہ انگریزوں سے نہ الجھیں۔ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد نے اس پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور جلد ہی یہ ہندوؤں کی جماعت بن گئی۔ سرسید احمد نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا کیوں کہ وہ ہندوؤں کے خودغرضانہ عزائم سے آگاہ ہو گئے تھے کہ وہ انگریزوں کے ملک چھوڑ جانے کے بعد برصغیر میں ہندو حکومت قائم کر کے مسلمانوں کو اپنا زیرِنگین بنانا چاہتے ہیں۔

3۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام:

دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں سالانہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اختتام پر برصغیر کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مسلم زعما نے ایک اجلاس میں شرکت کی جو ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خان نے خصوصی طور پر بلایا تھا۔ اِس اجلاس میں دوسری باتوں کے علاوہ تقسیم بنگال 1905ء کے خلاف چلائی گئی ہندوؤں کی تحریک کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا گیا اور یہ طے پایا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے ایک منظم سیاسی جماعت تشکیل دی جائے جو اُن کے حقوق کا تحفظ کرے۔ اِس

اجلاس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، حکیم اجمل خان اور دیگر علماء اور نمایاں رہنماؤں نے اِس اجلاس میں شرکت کی۔ 30 دسمبر 1906ء کو ایک سیاسی جماعت ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کے نام سے تشکیل دی گئی۔ علی گڑھ کو اِس کا صدر مقام بنایا گیا اور جلد ہی سر آغا خان (سوم) آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر اور سید علی حسن بلگرامی کو سیکریٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

مسلم لیگ کے قیام کے اغراض و مقاصد:

(i) برطانوی حکومت اور مسلمانوں کے درمیان خیر سگالی کے جذبات اور دوستانہ تعلقات قائم کرنا اور انگریزوں کے ذہن سے مسلمانوں کے خلاف شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا۔

(ii) مشترکہ فلاح و بہبود کے لیے برصغیر کی دوسری اقوام اور سیاسی جماعتوں سے تعلقات استوار کرنا۔

(iii) حکومت اور دیگر سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کرتے ہوئے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنا۔

آزادی کی جدوجہد میں مسلم لیگ کا کردار:

1906ء میں مسلم لیگ کی تشکیل کے بعد ہی سے اِس نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک پلیٹ فارم کی شکل اختیار کر لی۔ جہاں سے وہ اپنے حقوق اور انگریزوں سے حصولِ آزادی کے لیے جدوجہد کر سکتے تھے۔ مسلم لیگ کی یہ جدوجہد بے شمار مشکلات سے گزری۔ مسلم لیگ کے کردار کو مختصراً ذیل کے مطابق بیان کیا جا سکتا ہے۔

(i) حقوق کا تحفظ:

ایک نمائندہ سیاسی جماعت کے طور پر قیام کے فوراً بعد مسلم لیگ کا فوری ہدف یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب اقدام اُٹھائیں اور حکومت کو اُن کے مسائل اور مطالبات سے آگاہ کیا جائے۔ ایک جانب مسلم لیگ نے انگریزوں کو برصغیر سے نکالنے کے لیے ہندوؤں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ملانے اور تعاون کرنے میں انتہائی متوازن رویہ اختیار کیا اور دوسری جانب اِس نے مسلمانوں اور برطانوی سرکار کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کی۔

(ii) کانگریس کے ساتھ سیاسی سمجھوتہ:

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اکتوبر 1913ء میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اُن کی کوششوں سے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان دسمبر 1916ء میں ایک سمجھوتہ طے پایا۔ جو ''میثاقِ لکھنؤ'' کے نام سے معروف ہے۔ اِس میثاق کی

روسے کانگریس نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم کرلیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے مطالبے کو بھی تسلیم کیا گیا۔

(iii) مسلمانوں کی تعداد:

مرکزی مجلس قانون ساز (سینٹرل لیجسلیٹیو اسمبلی) میں مسلم اراکین کی تعداد ایک تہائی طے پائی۔

(iv) نشستیں:

مسلم اکثریت کے دونوں صوبوں یعنی بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی اکثریت مستحکم ہوگئی۔

(v) متناسب نمائندگی:

اُن صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے وہاں اُن کی نمائندگی اُن کے آبادی کے تناسب سے زیادہ کردی گئی۔

4۔ قائداعظمؒ کے چودہ نکات:

1920ء کے عشرے میں برصغیر میں کئی اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے۔ ان میں تحریکِ خلافت، تحریکِ ہجرت اور تحریکِ عدم تعاون قابلِ ذکر ہیں، جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے ایک دوسرے سے مل کر کام کیا لیکن یہ اتحاد زیادہ دیر نہ چل سکا۔ ہندوؤں کی مسلمان دشمنی اجاگر ہوگئی۔ مسلمانوں کے خلاف کانگریس کے متعصبانہ رویہ کا سب سے بڑا ثبوت نہرو رپورٹ 1928ء کی اشاعت تھی جس میں میثاق لکھنؤ کی ان شقوں کو رد کردیا گیا جو مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے منظور کی گئی تھیں۔ نہرو رپورٹ نے جداگانہ انتخابات کے اصول کو رد کرتے ہوئے ان تمام تحفظات کو مسترد کردیا جو مسلمان اپنے علیحدہ قومی تشخص کی بقاء اور ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔

قائدِاعظم نے نہرو رپورٹ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ برصغیر کے سیاسی مسائل پر مسلمانوں کے نقطہ ءنظر پیش کرنے کے لیے آپ نے 1929ء میں رہنما اصولوں کا خاکہ تیار کیا جو چودہ نکات پر مشتمل ہے۔ یہ رہنما اصول قائداعظمؒ کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ نکات درجِ ذیل ہیں۔

1۔ آئندہ آئین وفاقی طرز کا ہو جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔

2۔ تمام صوبوں کو ایک ہی اصول پر داخلی خودمختاری دی جائے۔

3۔ تمام مجلسِ قانون ساز اور دیگر منتخب اداروں میں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی دی جائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ اکثریت اقلیت میں نہ بدلی جائے۔

تھی۔ وہ کسی طرح بھی اس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ کانگریس اور ہندو مسلمانوں کے علیحدہ وجود کو ختم کر کے انھیں سیاسی اور معاشرتی حقوق سے محروم کر دیں۔

5۔علامہ اقبالؒ کا خطبہ الٰہ آباد:

مسلمانانِ برصغیر کی یہ خواہش تھی کہ ان کا الگ تشخص تسلیم کیا جائے۔اس سلسلہ کی کڑی علامہ اقبالؒ کا خطبہ الٰہ آباد(1930ء) ہے۔کیونکہ مسلمان یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حقوق کو سلب کر لیا جائے۔لہٰذا مسلمانوں نے اپنے لیے الگ ملک کا مطالبہ کر دیا جس کو علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبہ میں اس طرح پیش کیا۔

''میری خواہش ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دی جائے۔خواہ ہندوستان برطانوی سلطنت کے اندر رہ کر آزادی حاصل کرے۔ مجھے شمال مغربی مسلم ریاست کا قیام مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی علاقوں کے مسلمانوں کا مقدر نظر آتا ہے۔''

قائدِ اعظمؒ کی خواہش تھی کہ مسلمان برصغیر میں ایک قوت بن کر ابھریں۔علامہ اقبالؒ نے اس تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے خطبہ الٰہ آباد میں الگ ریاست کا تصور دیا۔1933ء میں چوہدری رحمت علی نے علامہ اقبالؒ کے اس تصور کو پاکستان کا نام دیا۔قائدِ اعظمؒ نے1934ء میں مسلم لیگ کی باگ ڈور سنبھالی اور مسلمانوں کے سیاسی استحکام کے لیے اس جماعت کو مضبوط اور فعال بنایا۔

6۔1935ء کا ایکٹ اور صوبائی خودمختاری:

1935ء میں برطانوی حکومت نے برصغیر میں ایک نیا آئین متعارف کرایا جس میں صوبائی خودمختاری کو اولیّت دی گئی اور اس آئین کے تحت 1937ء میں انتخابات کرائے گئے جس میں کانگریس نے واضح اکثریت حاصل کی۔ اکثریت حاصل کرنے کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کے تشخص کے خاتمے کا پروگرام بنایا۔برصغیر میں سات صوبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے غرور میں مسلم ثقافت مسخ کرنا شروع کر دی۔ہندوؤں نے اس سلسلہ میں مسلمانوں کے مذہب پر پابندی لگانے کی کوششیں کیں، مسجدوں کے باہر شوروغل کرنا شروع کر دیا۔مسلمانوں پر ملازمتوں کے دروازے بند کرائے، اسکولوں میں اُردو کی جگہ ہندی رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔گاندھی کی مورتی کی پوجا کرنے پر زور دیا گیا۔ مسلمان بچوں کو ماتھوں پر تلک لگانے کو کہا جانے لگا۔بندے ماترم کا ترانہ گانے کے لیے مجبور کیا گیا جس میں مسلمانوں کے خلاف ابھارا گیا تھا۔اس رویہ کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں میں الگ ملک کے مطالبے کی شدت اور بڑھ گئی۔

4۔ مرکزی مجلسِ قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

5۔ جدا انتخاب کا اصول ہر فرقے پر لاگو ہوگا۔ البتہ اگر کوئی فرقہ چاہے تو اپنی مرضی سے مخلوط انتخاب قبول کر سکتا ہے۔

6۔ اگر کبھی صوبوں کی حدود میں تبدیلی کرنا مقصود ہو تو اس بات کا خیال رکھا جائے کہ اس تبدیلی کا مسلم اکثریت والے صوبوں یعنی پنجاب، بنگال اور مغربی سرحدی صوبے پر اثر نہ پڑے۔

7۔ تمام فرقوں کو یکساں اور مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو۔

8۔ اگر کوئی مسودۂ قانون کسی فرقے سے متعلق ہو اور اس فرقے کے کم از کم تین چوتھائی ممبران اسمبلی مسودۂ قانون کے خلاف رائے دیں تو اسے مسترد قرار دیا جائے۔

9۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

10۔ صوبہ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں دوسرے صوبوں کی مانند اصلاحات نافذ کی جائے۔

11۔ آئین میں یہ بات واضح کر دی جائے کہ مسلمانوں کو تمام ملازمتوں میں ان کی اہلیت کے مطابق حصہ دیا جائے۔

12۔ مسلمانوں کو ہر قسم کا مذہبی و ثقافتی تحفظ دیا جائے۔

13۔ صوبائی اور مرکزی وزارتوں میں مسلمانوں کو کم از کم ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

14۔ وفاق میں شامل صوبوں کی منظوری کے بغیر مرکزی آئین میں کوئی ردّ و بدل نہ کیا جائے۔

نہرو رپورٹ کی سفارشات اور قائد اعظمؒ کے چودہ نکات کے موازنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان سیاسی خلیج کافی وسیع ہو گئی تھی۔ کانگریس اور اس کے ہندو رہنما برصغیر میں ایسا آئین نافذ کروانا چاہتے تھے جس میں ہندو اپنی عددی اکثریت کی بناء پر اس کے حاکم بن جائیں اور مسلمانوں کو اپنا دست نگر بنا لیں۔ وہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی حیثیت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ ہی ان کے مفادات و حقوق کے لیے خصوصی تحفظات مہیا کرنے پر رضامند تھے۔

مسلمانوں کی خواہش تھی کہ ان کے علیحدہ تشخص کو تسلیم کیا جائے اور برصغیر کے دستور میں ایسے تحفظات مہیا کیے جائیں جن سے مسلمانوں کے حقوق اور مخصوص مفادات کی حفاظت ممکن ہو۔ برصغیر کے مسلمانوں کو یقین تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، مذہب و عقائد اور علیحدہ تشخص مسخ ہو جائے گا۔ یہ صورتحال مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ

1938ء میں محمد علی جناحؒ پٹنہ اجلاس میں قائدِ اعظمؒ کے خطاب سے نوازے گئے۔1939ء میں جب کانگریسی وزارتوں کا خاتمہ ہوا تو قائدِ اعظمؒ نے مسلمانوں کو 22 دسمبر 1939ء کو یوم نجات منانے کا مشورہ دیا۔

7۔تحریکِ پاکستان:

1906ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد سے ہی تحریکِ پاکستان جاری ہوگئی، یہ تحریک کئی نازک مراحل سے گزری لیکن اس کو 1940ء کی قراردادِ لاہور (قراردادِ پاکستان) کے بعد نیا جوش وجذبہ اور ولولہ حاصل ہوا۔

(i) قراردادِ لاہور 1940ء:

مارچ 1940ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منٹو پارک لاہور میں منعقد ہوا۔اس اجلاس کی صدارت قائدِ اعظمؒ نے کی۔قائدِ اعظمؒ نے اپنی تقریر میں کہا کہ" ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب الگ، ان کی طرزِ معاشرت الگ، رسم ورواج الگ، ان کا ادب الگ۔نہ وہ آپس میں شادی بیاہ کر سکتے ہیں نہ اکٹھا کھانا کھا سکتے ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ ہندو، مسلمان دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں خیالات اور تصورات کے لحاظ سے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ان دونوں قوموں کو جن میں ایک کی تعداد زیادہ ہے اور دوسرے کی کم۔ایک گاڑی میں جوتنا یعنی ان کی ایک مشترکہ مملکت قائم کرنا سرے سے غلط ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بددلی اور بے اطمینانی پھیلے گی۔آپس میں جھگڑے ایسا طول پکڑیں گے کہ آخرکار یہ حکومت ہی مٹ جائے گی۔"

قائدِ اعظمؒ کی تقریر کے بعد 23 مارچ کو بنگال کے وزیرِ اعلیٰ مولوی فضل الحق نے وہ اہم قرارداد پیش کی جو قراردادِ پاکستان کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔اس قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ "ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اس طرح کی مسلم مملکتیں قائم کی جائیں جو خود مختار اور آزاد ہوں۔ان علاقوں کی اقلیتوں کے لیے آئین میں معین اور مؤثر تحفظات کا بندوبست کیا جائے۔اسی طرح ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان سے مشورے سے معین اور مؤثر طریقے پر ان کے حقوق کے تحفظ کا مناسب انتظام کیا جائے۔"

اِس قرارداد سے ہندو سراسیمہ ہوگئے اور اُنھوں نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے مطالبے کو نامنظور کر دیا جائے۔لیکن مسلمان قائدِ اعظمؒ کی قیادت اور رہنمائی میں متحد ہو چکے تھے اور وہ اپنے اعلیٰ مقصد کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینے کو تیار تھے۔قراردادِ لاہور ہی دراصل پاکستان کی اصل بنیاد بنی۔

(ii) آئینی اور دستوری تجاویز (کرپس مشن 1942ء):

برصغیر کے سیاسی تعطل کو دور کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے سر اسٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں 23 مارچ 1942ء کو ایک مشن ہندوستان بھیجا۔ اِس مشن نے کانگریس، مسلم لیگ اور ہندوستان کی دیگر اقلیتی جماعتوں سے اپنی تجاویز پر گفت وشنید کی۔ ایک ہفتے کی گفت وشنید کے بعد کرپس نے 29 مارچ 1942ء کو اپنی تجاویز کا اعلان کیا جو یہ تھیں:

(1) دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر ہندوستان کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی تشکیل دی جائے گی جو ملک کے لیے دستور تیار کرے گی لیکن جنگ کے دوران ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ برقرار رہے گا۔

(2) مجوزہ دستور وفاقی طرز کا ہوگا جس میں تمام صوبے اور ریاستیں شریک ہوں گی۔

(3) وفاقی دستور میں کسی بھی آئینی صوبے یا وفاق کی ریاست کو یہ حق دیا جائے گا کہ وہ دس سال بعد بطور وفاقی اکائی علیحدگی اختیار کر لے اور جو اکائیاں علیحدگی اختیار کریں گی وہ اپنا وفاق بنا سکیں گی۔

لیکن اِن تجاویز کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے نامنظور کر دیا۔ کانگریس نے اس لیے اس کو تسلیم نہیں کیا کہ اس میں ہندوستان کی تقسیم کی تجویز تھی اور مسلم لیگ نے اس لیے اس کو قبول نہیں کیا کیوں کہ اس میں تخلیقِ پاکستان کی یقین دہانی نہیں تھی۔ کرپس مشن ناکام ہوگیا اور ہندوستان کی سیاسی صورتحال بد سے بدتر ہوگئی۔

(iii) شملہ کانفرنس 1945:

دوسری جنگِ عظیم کے بعد لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے بن گئے۔ برصغیر کو متحد کرنے کے لیے اور مرکز میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت بنانے کے لیے انھوں نے جون 1945ء میں شملہ میں برصغیر کی تمام سیاسی جماعتوں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ قائدِ اعظمؒ مسلم لیگ کی نمائندگی کر رہے تھے جبکہ کانگریس نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ مولانا آزاد کو اس اجلاس میں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کو یہ پیغام دیا جائے کہ کانگریس مسلمانوں کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ کانفرنس 25 جون 1945ء کو شروع ہوئی اور کئی روز تک جاری رہی۔ لارڈ ویول یہ چاہتے تھے کہ پانچ وزراء مسلمانوں میں سے، پانچ وزراء ہندوؤں میں سے اور تین وزراء دیگر اقلیتوں میں سے لیے جائیں۔ کانگریس مسلمانوں میں سے پانچ نامزدگیوں کے حق میں نہیں تھی۔ اُس کا مطالبہ تھا کہ صرف ایک مسلم وزیر نامزد کیا جائے اور اُس کی نامزدگی بھی وہ خود کرے گی۔ اِس پر قائدِ اعظمؒ نے ملک میں عام انتخابات کا مطالبہ کر دیا کہ یہ فیصلہ ہو سکے کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق کس کو ہے۔ کانگریس کے منفی رویے کی وجہ سے یہ کانفرنس ناکام ہوگئی۔ لیکن ماسوائے کانگریس دیگر تمام جماعتوں نے عام

انتخابات کے لیے قائداعظمؒ کے مطالبے کی حمایت کردی۔ اس موقع پر اکثر مسلم علماء نے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ اس حمایت سے مسلم لیگ کو تقویت حاصل ہوئی اور یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی انتہائی مقبول جماعت بن گئی۔

(iv) عام انتخابات 1945-46:

دسمبر 1945ء میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان کے نعرہ پر ان انتخابات میں حصہ لیا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے مسلم لیگ کی بھرپور حمایت کی۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی تمام تیس کی تیس نشستیں جیت لیں۔ کانگریس کو 72 سے صرف 57 پر کامیابی حاصل ہوئی۔ سندھ، پنجاب اور بنگال میں مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل ہوگئی۔

فروری 1946ء میں صوبائی انتخابات منعقد ہوئے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی 495 نشستوں میں سے 430 پر کامیابی حاصل کی۔ مسلم لیگ نے بنگال میں اپنی حکومت بنائی۔ لیکن کانگریس کی سازشوں کی وجہ سے وہ اسمبلی توڑ دی گئی۔ 1946ء میں پھر دوبارہ انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے سندھ میں تمام نشستیں جیت لیں اور اپنی حکومت بنالی۔ کانگریس نے پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مخلوط حکومتیں قائم کیں۔

(v) 3 جون کا منصوبہ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن:

مارچ 1947ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن برصغیر کے وائسرائے بن کر آئے جنھوں نے برصغیر کو متحدہ رکھنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تقسیمِ برصغیر کے علاوہ برصغیر کے سیاسی مسئلے کا کوئی اور حل نظر نہیں آتا۔

(vi) 3 جون کا منصوبہ اور قیامِ پاکستان:

3 جون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کا اعلان کیا گیا جس کی رو سے اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ 14 اگست 1947ء تک اقتدار ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس قانون کی منظوری کے بعد قانون آزادیٔ ہند 1947ء کہلایا۔ 3 جون کے منصوبے میں ایک شق یہ بھی تھی کہ پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے ہندو اور مسلمان اراکین الگ الگ اجلاس ہونگے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے تو اس تجویز پر عمل کیا جائے گا جبکہ صوبوں کی حد بندی ایک کمیشن کرے گا۔ سندھ اسمبلی کثرت رائے سے صوبے کے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ کے عوام پاکستان یا بھارت میں شمولیت کا فیصلہ استصوابِ رائے کے ذریعے کریں گے۔ سندھ اسمبلی نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا اور سلہٹ اور سرحد کے لوگوں نے بھی پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔

(vii) قانون آزادئ ہند، جولائی 1947ء:

3 جون کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ نے 16 جولائی 1947ء کو قانون آزادئ ہند منظور کیا۔ قائد اعظم محمد علی جناحؒ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔

(viii) ریڈکلف ایوارڈ:

پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کی تقسیم کا فیصلہ ہونے لگا تو برطانوی حکومت نے سر ریڈکلف کی سربراہی میں ایک حد بندی کمیشن قائم کیا۔ جس میں پنجاب کی حد بندی کے لیے پاکستان کے نمائندے جسٹس منیر اور جسٹس دین محمد جبکہ بھارت کے نمائندے مہر چاند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ تھے جو ہائیکورٹ کے جج تھے۔

بنگال کی حد بندی کے لیے پاکستان کی طرف سے جسٹس ابو صالح محمد، ایس، اے رحمان، محمد اکرم جبکہ بھارت کی طرف سے سی۔ سی بسواس اور بی۔ کے مکرجی تھے۔ تقسیم کے وقت وائسرائے اور ان کے عملے نے کانگریس سے گٹھ جوڑ کر کے حد بندی کا فیصلہ کر لیا اور ریڈکلف کو دستخط کرنے والی مشین کے طور پر استعمال کیا گیا۔ تقسیم میں ریڈکلف نے مشرقی پنجاب کے مسلم اکثریت کے کئی علاقے بھارت میں شامل کر کے ایک جانب پاکستان کو ستلج، بیاس اور راوی کے پانی سے محروم کر دیا جبکہ دوسری جانب بھارت کی سرحد کو کشمیر کے ساتھ ملا دیا۔

پاکستان اور بھارت کی غیر منصفانہ تقسیم سے نفرتوں کی دیواریں اور زیادہ مضبوط ہو گئیں اور دونوں قوموں کے درمیان امن و سکون کی بجائے انتقامی جذبے فروغ پانے لگے۔

قیامِ پاکستان کے بعد برصغیر فرقہ ورانہ فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔ پنجاب، دہلی اور بہار میں وسیع پیمانے پر فسادات ہوئے جن میں 15 لاکھ افراد قتل ہوئے، پچاس ہزار (50,000) خواتین اغوا ہوئیں اور ایک کروڑ سے زائد افراد کو ترکِ وطن ہونا پڑا۔

نوزائیدہ مملکت میں اتنی بڑی تعداد میں مہاجرین کو سنبھالا دینا مشکل کام تھا۔ کشمیر کو عوام کی مرضی کے خلاف بھارت میں شامل کر لیا۔ جبکہ جوناگڑھ اور مناوادر کی دو ریاستوں کو طاقت کے بل بوتے پر قبضے میں لے لیا گیا۔

آزادی کے وقت برصغیر میں تقریباً ساڑھے چار سو کے قریب نیم خود مختار ریاستیں تھیں جن کو کہا گیا کہ وہ چاہیں تو آزاد رہ سکتی ہیں یا پاکستان اور بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ شامل ہو سکتی ہیں۔ کشمیر اور حیدر آباد کی ریاستوں نے آزاد رہنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان بننے کے بعد کشمیر کے مسئلہ پر بھارت اور پاکستان کے درمیان تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ بھارت اس مسئلہ کو خود اقوامِ متحدہ میں لے گیا جہاں آج بھی سلامتی کونسل کے ایجنڈا میں مسئلہ کشمیر حل طلب ہے۔

8۔ تحریکِ پاکستان میں مختلف صوبوں کا کردار:

برصغیر کے مسلمانوں کی طویل جدو جہد کے بدولت پاکستان وجود میں آیا۔ تمام صوبوں کے عوام نے تحریکِ پاکستان کو مقبول بنانے میں حصہ لیا۔ مسلم رہنماؤں نے برصغیر کے کونے کونے تک پاکستان کا پیغام پہنچایا۔ ذیل میں تحریکِ پاکستان میں مختلف صوبوں کا کردار بیان کیا جا رہا ہے۔

i۔ صوبہء پنجاب:

آبادی اور وسائل کے اعتبار سے پنجاب سب سے بڑا صوبہ تھا۔ لیکن ہندوؤں اور انگریزوں کی باہمی سازشوں اور ملی بھگت سے یہاں کے عوام کو دبا کر رکھا گیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی فکر اور شاعری کے ذریعے عوام میں اسلامی روح پھونک دی اور سب سے پہلے اُنھوں نے ہی اسلامی ریاست کے تصور کو اُجاگر کیا۔ قراردادِ پاکستان بھی پنجاب کے سب سے بڑے شہر اور دارالحکومت لاہور میں 23 مارچ 1940ء کو منظور کی گئی۔ اُس کے بعد مسلم لیگ نے پاکستان کے تصور کو پورے پنجاب میں مشہور کر دیا۔ 46-1945ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں تقریباً نوے فیصد مسلم نشستوں پر کامیابی حاصل کر کے اکثریت حاصل کر لی۔ اِس تحریک کے نمایاں رہنماؤں میں نواب افتخار حسین ممدوٹ، میاں ممتاز احمد خان دولتانہ، میاں افتخار الدین، میاں امیر الدین، راجہ غضنفر علی خان اور دیگر زعماء شامل تھے۔

پنجاب کے علماء اور مذہبی عمائدین نے پنجاب کے عوام کو آزادی کے لیے آمادہ کیا۔ اُنھوں نے پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی اور آزاد مسلم ریاست کا مطالبہ کیا۔ 1941ء میں قائدِ اعظمؒ نے اسلامیہ کالج لاہور میں منعقدہ پاکستان کانفرنس کی صدارت فرمائی۔ پنجاب کے طلبہ نے پنجاب کی یونینسٹ حکومت کی مخالفت کی۔ اِس حکومت کو انگریزوں اور ہندوؤں کی حمایت حاصل تھی لیکن بالآخر اِس حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور اِس طرح تخلیقِ پاکستان کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ پنجاب کی خواتین نے بھی اِس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ پنجاب میں سول نافرمانی کی تحریک کے دوران ایک بہادر خاتون صغریٰ فاطمہ (صغریٰ آفتاب) پنجاب سیکریٹریٹ (سول سیکریٹریٹ لاہور) سے برطانوی جھنڈا (یونین جیک) اُتار پھینکا اور اس کی جگہ مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا دیا۔

ii۔ صوبہء سندھ:

صوبہء سندھ کو باب الاسلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِس صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت کو کم کرنے کے لیے انگریزوں نے اس کو صوبہء بمبئی کا حصہ بنا دیا۔ مسلم لیگ کی جدوجہد کی بدولت 1935ء کے حکومتِ ہند

قانون (ایکٹ) کے تحت سندھ کو علیحدہ صوبے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس دسمبر 1907ء میں کراچی میں منعقد ہوا۔ سندھ وہ پہلا صوبہ تھا جس میں مسلم لیگ نے اکتوبر 1938ء میں ایک قرارداد منظور کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم کی جائے۔ یہ قرارداد مارچ 1940ء کی قراردادِ پاکستان کی پیش خیمہ بنی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران سید صبغت اللہ شاہ پگارو نے انگریز حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی۔ یہ جدوجہد "حرتحریک" کے نام سے مشہور ہے۔ حالانکہ پیر پگارو نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن اس تحریک کے نتیجے میں تحریکِ پاکستان کو بڑی تقویت ملی۔ 1945-46ء کے انتخابات میں صوبہ سندھ میں مسلم لیگ نے اکثریت حاصل کر لی اور اپنی حکومت بنالی۔ سندھ کے مسلمانوں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ سر عبداللہ ہارون، محمد ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ، شیخ عبدالمجید سندھی، سر غلام حسین ہدایت اللہ، پیر الٰہی بخش، جی الانا، رئیس غلام محمد خان بھرگڑی اور قاضی محمد اکبر وہ ممتاز رہنما اور قائدین تھے جنہوں نے صوبہ سندھ میں مسلم لیگ کو مقبول بنایا۔ سندھ کے علماء اور دینی رہنماؤں نے بھی اس تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پوری جدوجہدِ آزادی کے دوران سندھ کے عوام تحریکِ پاکستان کے وفادار اور جان نثار رہے۔

iii۔ صوبہ بلوچستان:

اگرچہ رقبے کے لحاظ سے بلوچستان سب سے بڑا صوبہ تھا مگر انگریزوں نے اُسے ہمیشہ پسماندہ رکھنے کی کوشش کی۔ بلوچستان کے قاضی محمد عیسیٰ 1939ء میں مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ (ورکنگ کمیٹی) میں شامل ہوئے۔ اُنھوں نے بلوچستان میں مسلم لیگ قائم کی اور کئی قبائلی زعما اس میں شامل ہو گئے۔ جلد ہی مسلم لیگ بلوچستان کی ایک مقبول جماعت بن گئی۔ میر جعفر خان جمالی، میر قادر بخش زہری، سردار باز جان اور نواب محمد خان جوگیزئی نے بلوچستان کے مختلف علاقوں میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقد کیے اور عوام تک قائدِ اعظمؒ کا پیغام پہنچایا۔ خان آف قلات میر احمد یار خان نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی۔ 23 مارچ 1941ء کو کوئٹہ میں یومِ پاکستان منایا گیا جس میں قاضی محمد عیسیٰ کی قیادت میں لوگوں نے ایک بڑی ریلی نکالی۔ 1943ء میں بلوچستان مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے وقت بلوچستان کے شاہی جرگے نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

iv۔ صوبہ سرحد (خیبر پختونخوا صوبہ):

صوبہ سرحد کے عوام اپنی بہادری اور مذہبی ذہنیت کی شہرت رکھتے تھے۔ انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے اس صوبے میں اولاً کوئی حقیقی دستور نہیں تھا۔ قائدِ اعظمؒ کے مطالبے پر 1927ء میں دستوری اصلاحات کا آغاز ہوا۔ 1940ء میں سردار اورنگ زیب نے قراردادِ پاکستان کی تائید و توثیق کی۔ لیکن 1945ء تک صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کو منظم نہیں

کیا جاسکا۔ اِس صورتِ حال کا کانگریس نے فائدہ اُٹھایااور پاکستان مخالف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ کانگریس کو خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت حاصل تھی۔صوبے کے پہلے انتخابات میں کانگریس نے اپنی وزارت بنالی اور ڈاکٹر خان صاحب وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ یہ وقت تھا جب مسلم لیگ کی تنظیم کا آغاز ہوا، سردار اورنگ زیب خان، جسٹس سجاد احمد جان اور خان بہادر اسد اللہ خان کی کوششوں سے 1939ء میں ایبٹ آباد میں مسلم لیگ کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ یہ کانفرنس سرحد کے مسلمانوں میں تحریکِ آزادی کی روح پھونکنے کا آلہ کار ثابت ہوئی۔کئی اضلاع میں مسلم لیگ کے دفاتر کھولے گئے۔ مسلم لیگ کے عروج اور کانگریس کے اثرات کم ہونا شروع ہوگئے۔کانگریس حکومت نے مسلم لیگ کے قائدین اور کارکنوں پر دباؤ بڑھانا شروع کردیا۔مسلم لیگ نے 1947ء میں صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کردی۔کارکنان کی ایک بڑی تعداد کو بے بنیاد اور جھوٹے مقدمات میں ملوث کردیا گیا۔تقریباً آٹھ ہزار کارکنوں کو گھروں میں نظر بند کردیا گیا۔لیکن مسلم لیگ کی تحریک بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔مذہبی رہنماؤں نے اس تحریک میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔اسلامیہ کالج پشاور اور ایڈورڈ کالج کے طلبہ تصورِ پاکستان کو نمایاں کرنے میں سب سے اگلی صفوں میں کھڑے تھے۔کانگریس کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور اُس کا زور ٹوٹ گیا اور مسلم لیگ ایک مقبول سیاسی جماعت بن گئی۔اس طرح 14 اگست 1947ء کو یہ پاکستان کا حصہ بن گیا۔

اپریل 2010ء کو آئین میں اٹھارویں ترمیم کے بعد صوبہء سرحد کا نیا نام خیبر پختونخوا رکھا گیا ہے۔

9۔ 14 اگست 1947ء کی اہمیت:

پاکستان اور بھارت نے ایک دن کے فرق سے آزادی حاصل کی۔ پاکستان 14 اگست 1947ء (27 رمضان 1366ھ) کو آزاد ہوگیا جبکہ بھارت 15 اگست 1947ء کو۔ یہ بھی قدرت کی طرف سے ایک انعام تھا کہ 14 اگست 1947ء کو ہی رمضان کی ستائیسویں شب تھی۔ اِس شب کو "لیلتہ القدر" کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔یعنی نیکیوں، بھلائیوں اور قدر کی رات۔

کیونکہ برطانوی ہند (جنوبی ایشیا کا وہ خطہ تھا جس پر انگریز براہِ راست حکمرانی کر رہے تھے) کو تقسیم ہونا تھا۔اِس لیے بڑی فطری بات تھی کہ پاکستان، بھارت سے ایک روز قبل آزاد ملک کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آیا۔انگریزوں کے زیرِ اقتدار مقامی ریاستوں سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنے جغرافیائی محلِ وقوع اور اپنے عوام کے مذہبی تشخص کی بنیاد پر پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرلیں۔ لیکن جموں اور کشمیر کے راجا نے اِس کی پیروی نہیں کی۔ اِس لیے یہ آج تک ایک متنازعہ علاقہ ہے۔

10۔ نظریاتی ریاست کے شہریوں کی ذمہ داری:

قائداعظمؒ نے 15 جون 1948ء کو قوم سے خطاب کیا اور اُنھیں صوبائیت اور نسل پرستی کے خطرات سے اِن الفاظ میں آگاہ فرمایا:

''اب ہم بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور بنگالی کے بجائے صرف پاکستانی ہیں۔ ہماری سوچ اور فعل وعمل ایک پاکستانی کے شایانِ شان ہونا چاہیے اور ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے''۔

جدوجہدِ پاکستان کے پس منظر میں یہ فکروفلسفہ کارفرما تھا کہ ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کی جائے جہاں مسلمان اسلام کے ابدی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔ اِس پس منظر میں پاکستان کا تصور ایک نظریاتی ریاست کا تھا۔ اور نظریاتی ریاست اپنے عوام سے مندرجہ ذیل ذمہ داریوں کا تقاضا کرتی ہے۔

(i) وہ اپنی زندگی اسلامی تعلیمات کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کریں گے، جو اِس ملک کی بنیادی اساس ہیں۔ اِس اصول کا تقاضا تھا کہ اسلامی شریعت کے مطابق قوانین وقواعد وضوابط مرتب کیے جائیں۔

(ii) وہ ایک ایسا جمہوری نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کریں گے جس کی بنیادیں اسلامی اصولوں پر رکھی گئی ہوں۔ مغربی طرز کا جمہوری نظام پاکستان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ سب کے لیے آزادی، احترام، عزت وتکریم اور مساوات کا جمہوری اصول ہی زندگی گزارنے کا واحد مناسب طریقہ ہے۔

(iii) نظریاتی ریاست کے ہر شہری کو وفادار اور محبِ وطن ہونا چاہیے اور آزمائش کے وقت ریاست ومملکت کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اُس کا ذاتی مفاد ریاست ومملکت کے مفاد سے بالاتر نہیں ہونا چاہیے۔

(iv) ہر شہری کو رزقِ حلال کمانا چاہیے اور کبھی بھی کسی فراڈ یا دھوکے میں ملوث نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی دوسروں کو فریب دینا چاہیے۔

(v) اُن کا رویہ ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شخص کا ہونا چاہیے۔ اُن کے لیے یہ لازمی ہو کہ وہ خود تعلیم حاصل کریں کیوں کہ تعلیم ہی تمام کامیابیوں کی کلید ہے۔

(vi) اُن کو ریاست کے قوانین کا احترام کرنا چاہیے اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ اُن کو کبھی تشدد پر نہیں اُترنا چاہیے اور قوانین وقواعد وضوابط کی خلاف ورزی سے بچنا چاہیے۔

(vii) اُن کو ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہیے جو قومی یکجہتی ، وقار اور ترقی کو فروغ دیتی ہوں۔ اُن کو سماج دشمن عناصر کی سرگرمیوں کے خلاف حکومت کی مدد کرنا چاہیے۔

(viii) اُن کو سخت محنت کش ہونا چاہیے اور معاشرے کی فلاح و بہبود میں حصہ لینا چاہیے۔

(ix) اُن کو ہمیشہ دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہنا چاہیے اور اپنے فرائض پوری ذمہ داری اور توجہ سے ادا کرنا چاہییں۔ اُنھیں تمام ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرنا چاہییں۔

(x) اُنھیں مسلم اخوت اور اِنسانی عظمت کے لیے کام کرنا چاہیے۔

11۔ قائداعظمؒ کا بحیثیت پہلے گورنر جنرل کردار اور اُن کے کارنامے:

بحیثیت گورنر جنرل قائداعظمؒ کا کردار اُن کی ذاتی شخصیت ، بے داغ کردار، پاکستان سے محبت، قربانی، وابستگی اور عہد کی بے غرض اور بے لوث صفات کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ وہ ایک حقیقی معنوں میں سیاسی قائد اور رہنما تھے۔ اُن کی اپنی ذات میں کئی صفات جمع ہوگئی تھیں۔ اولاً ہم قائداعظمؒ کے کردار پر گفتگو کرتے ہیں۔

(i) وہ ایک بااصول شخص تھے اور اُنھوں نے ہمیشہ اپنے قول یا وعدے کے مطابق عمل کیا۔

(ii) وہ ایک ذہین سیاسی رہنما تھے اور اپنی ذات میں ہمہ جہت صفات جمع کر لی تھیں مثلاً تدبر، حوصلہ، جرأت، احساس ذمہ داری، وقار، عظمت، پاسداری، راست گوئی اور اپنے مقصد سے خلوص۔

(iii) وہ ایک ایماندار، دیانت دار اور جرأت مند شخص تھے اور برصغیر کے مسلمانوں کی بہبود اور اُن کے مفاد میں جو کچھ ہوتا تھا اُس پر بات کرتے جھجکتے نہیں تھے۔

(iv) وہ دلفریب اور انتہائی جاذب نظر شخصیت کے حامل تھے اور اُن کے انداز و اطوار انتہائی سلجھے ہوئے تھے۔ مجالس میں اُن کی موجودگی دوسروں کے لیے کشش کا باعث ہوتی تھی۔

(v) وہ انتہائی مضبوط کردار کے مالک تھے اور اُنھوں نے اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ خاص طور سے مسلمانوں اور پاکستان کے مفاد پر۔

(vi) وہ ایک پرعزم، مستقل مزاج، قوی الارادہ اور ثابت قدم شخص تھے، جو کبھی تھکتے نہیں تھے۔

(vii) اُنھوں نے اپنی زندگی پاکستان کے لیے وقف کر دی تھی۔ یہ اُن کی وسعت نظر، جرأت، بے لوث خدمت اور وابستگی ہی تھی جس کی بدولت وہ دنیا کے نقشے پر ظاہر ہونے کے فوراً بعد پاکستان کے بڑے بڑے مسائل کو حل کر سکے۔

(viii) وہ طلبا کی نوجوان نسل کے بہت بڑے حامی اور معترف تھے اور اُنھیں اسلام اور پاکستان کا مستقبل کا اسلحہ خانہ تصور کرتے تھے۔

قائداعظمؒ بحیثیت گورنر جنرل:

قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ کو ورثے میں بے شمار مسائل ملے۔ اِن بڑے مسائل میں بھارت سے آئے ہوئے مہاجرین کی بحالی۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان اثاثوں کی تقسیم، نہری پانی کا تنازع اور کشمیر کا مسئلہ شامل تھے۔ اِن حالات میں بحیثیتِ گورنر جنرل قائداعظمؒ نے اپنا فرضِ منصبی ذیل کے مطابق ادا کیا۔

(i) قومی یک جہتی:

پاکستان کے ابتدائی مسائل کا تقاضا تھا کہ اِس نئی مملکت کے عوام کے درمیان قومی یک جہتی اور بھرپور تعاون کا جذبہ پروان چڑھے۔ بھارت نے کبھی دل سے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا تھا اور ہندو رہنماؤں کا خیال خام تھا کہ پاکستان کا وجود ختم ہو جائے گا اور برصغیر پھر متحد ہو جائے گا۔ لیکن قائداعظمؒ کی ذہانت اور لیاقت تھی کہ اُنھوں نے اپنے خلوص، محنت اور پاکستان سے محبت کی بدولت یہاں کے لوگوں میں قومی روح وجذبہ اور حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا۔ قومی اتحاد و اتفاق نے فروغ پایا اور پاکستان ایک حقیقت بن گیا۔

(ii) مہاجرین کی بحالی:

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں 6.5 ملین (65 لاکھ) مسلمان بے گھر کر دیے گئے اور اُنھیں پاکستان ہجرت کرنے اور پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا۔ اُن کی بحالی پہاڑ جیسا کام تھا۔ قائداعظمؒ نے اِن مہاجروں کی بحالی پر فوری توجہ دی اور ''قائداعظم ریلیف فنڈ'' قائم کر دیا گیا۔ اُنھوں نے لوگوں سے عطیات جمع کرانے کی اپیل کی۔ قائداعظمؒ ذاتی طور پر اکتوبر 1947ء میں خود لاہور تشریف لائے تاکہ مشرقی پنجاب سے ترکِ وطن کرنے والے مہاجرین کے مسائل کا جائزہ لے سکیں اور اُن کی خوراک ور ہائش کا بندوبست کیا جائے۔ اُنھوں نے 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور میں ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کیا کہ یہ تمام پاکستانیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اِن مہاجرین کی ہر ممکن مدد کریں، جنھوں نے پاکستان کی خاطر اپنے گھروں کو چھوڑا ہے اور جنھیں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔

(iii) سرکاری افسران کے رویے میں تبدیلی:

قائداعظمؒ نے سرکاری افسران کو مشورہ دیا کہ وہ خود کو عوام کا خادم ثابت کریں۔ 25 مارچ 1948ء کو قائداعظمؒ نے سرکاری ملازمین سے خطاب کیا اور اُن کو ہدایت کی کہ وہ سیاسی یا گروہی وابستگی سے بلند تر ہو کر عوام کے خادمین کی

حیثیت سے اپنے فرائض ایمانداری اور دیانت داری سے سرانجام دیں۔ اِس سے عوام کی نظروں میں اُن کا مقام بلند ہوگا۔ قائداعظمؒ کی ہدایات نے ایک قومی روح وجذبہ پھونک دیا۔

(iv) صوبائی اور نسلی امتیاز کی نفی:

قائداعظمؒ نے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ خود کو پاکستانی کہلوانے پر فخر محسوس کریں اور ہر قسم کے نسلی امتیاز اور علاقائی تعصبات سے خود کو علیٰحدہ رکھیں۔ اُنھوں نے تمام صوبوں کا دورہ کیا اور ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی۔ آزاد قبائلی علاقے کی وزیرستان ایجنسی سے مسلح افواج کو ہٹا لیا گیا۔ اِس سے اس علاقے کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ وہ بھی پاکستان کا جزو لاینفک ہیں۔ مختلف آزاد ریاستوں کو پاکستان میں شامل کر لیا گیا۔ کراچی کو پاکستان کا دارالخلافہ قرار دیا گیا۔

(v) پاکستانی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین:

یکم جولائی 1948ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان (بینک دولت پاکستان) کا افتتاح کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا کہ پاکستان کے لیے مغربی معاشی اور اقتصادی نظام غیر مناسب ہے اور اس سے ملک کے عوام میں خوشحالی نہیں آسکتی ہے۔ ہمیں ایک ایسا نظام تشکیل دینا ہے جس کی بنیاد اسلامی مساوات اور عدل پر مبنی ہو۔ اس طرح شاید ساری دنیا میں ہم ایک نیا سماجی نظام متعارف کرا سکیں گے۔

(vi) خارجہ پالیسی:

آزادی کے فوراً بعد قائداعظمؒ نے پاکستان کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کے لیے اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اُن کی رہنمائی میں بہت جلد ہی بے شمار ممالک سے سفارتی تعلقات قائم ہوگئے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ تمام ممالک کے ساتھ اور خاص طور سے اپنے قریبی ہمسایوں اور اسلامی ممالک سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے جائیں۔ اِس سلسلے میں قائد کا کردار ایک انتہائی محبِ وطن شخص کا تھا۔

(vii) طلبہ کو ہدایات:

قائداعظمؒ اِس نظریے کے حامی تھے کہ پاکستان کے نوجوان ہی پاکستان کے مستقبل کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ اُنھوں نے طلبہ کو ہدایت کی کہ وہ پوری توجہ اپنی تعلیم پر دیں۔ اُنھوں نے قیامِ پاکستان میں طلبہ کے کردار کو سراہا لیکن یہ ہدایت کی کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ خود کو سیاست سے علیٰحدہ کر لیں۔

(viii) پاسداری و وابستگی:

1947ء میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے وقت قائداعظمؒ سخت بیمار تھے اور بہت زیادہ تھک چکے تھے۔ لیکن نوزائیدہ ملک کے عوام کے مسائل کو حل کرنے کے لیے شب و روز محنت کرتے رہے۔ اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اُنھوں نے اپنی کوششیں پاکستان کے استحکام اور سالمیت کے لیے مرکوز کر دیں۔ اِسی لیے اُنھیں ''بابائے قوم'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)۔

مشق

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

1۔ فرائضی تحریک کے کیا مقاصد تھے؟
2۔ بھارت 14 اگست 1947ء کو کیوں آزاد نہیں ہوا تھا؟
3۔ تحریکِ احیاء میں شاہ ولی اللہ کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
4۔ پنجاب اور خیبر پختونخوا سے معاشرتی برائیوں کو مٹانے کے لیے سید احمد شہید کی جدوجہد بیان کیجیے۔
5۔ علی گڑھ تحریک کے کارنامے بیان کیجیے۔
6۔ ''دوقومی نظریہ'' کیا ہے؟
7۔ جدوجہد پاکستان میں مسلم لیگ کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
8۔ جدوجہد پاکستان میں صوبوں نے کیا کردار ادا کیا تھا؟
9۔ ایک نظریاتی ریاست کے شہریوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟
10۔ قائداعظمؒ کے کردار کی وہ نمایاں صفات واضح کیجیے جو اُنھیں دوسروں کے لیے نمونہ بناتی ہیں۔
11۔ بحیثیتِ گورنر جنرل قائداعظمؒ کا کردار بیان کیجیے۔

(ب) مناسب الفاظ سے خالی جگہیں پُر کیجیے۔

(i) مسلم لیگ ---------- میں قائم ہوئی۔
(ii) علی گڑھ تحریک کے تحت 1862ء میں سائنٹفک سوسائٹی ---------- میں قائم ہوئی۔
(iii) بلوچستان میں مسلم لیگ ---------- نے قائم کی۔
(iv) شاہ ولی اللہ کا سال ---------- میں انتقال ہوا۔
(v) ---------- میں سندھ علیحدہ صوبہ بن گیا۔
(vi) پاکستان رمضان کی ---------- کو وجود میں آیا۔